# بَابُ التَّقرِیظ والانتقاد

## مکتوباتِ سُلیمانی

### سعید احمد اکبرآبادی

مرتبہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی۔ تقطیع متوسط ضخامت ۲۹۸ صفحات کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد پانچ روپے پتہ:۔ صدق جدید بک ایجنسی، کچہری روڈ۔ لکھنؤ۔

یہ کتاب مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے اُن دو سو تیس خطوط کا مجموعہ ہے جو مولانا موصوف نے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کو لکھے تھے، ان دونوں بزرگوں کا باہمی تعلق عنفوانِ شباب میں شروع ہوا اور اگرچہ اُس وقت دونوں کی راہیں بالکل الگ الگ تھیں، ایک اتنا کٹر مولوی کہ اڈیٹر الہلال کی آزاد مشربی کو برداشت نہیں کرسکا اور دوسرا اتنا خدا بیزار کہ اپنی تحریروں میں بھی اسے چھپاتا نہیں لیکن اس کے باوجود دونوں میں گہرا رابطۂ اخلاص ومودت تھا جو عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا اور ترقی کرتا رہا۔

زیرِ تبصرہ کتاب صرف جلد اول ہے، دونوں جلدوں کے خطوط کی مجموعی تعداد تین سو بہتر (۳۷۲) ہوگی، لائق مکتوب الیہ نے ان خطوط پر جو حواشی لکھے ہیں اُن کی تعداد بھی ایک ہزار سے کم نہیں، کاتب اور مکتوب الیہ دونوں دنیائے علم وادب کی نامور شخصیتیں ہیں اور خطوط کا زمانہ جو چالیس برس (از ۱۹۱۲ء تا ۱۹۵۳ء) پر پھیلا ہوا ہے، یہی وہ زمانہ ہے جس میں مسلمانوں کی بڑی بڑی علمی وتعلیمی اور مذہبی وسیاسی تحریکیں پیدا ہوئیں، عظیم الشان ادارے قائم ہوئے اور ہر میدان میں بلند پایہ شخصیتوں کا ظہور ہوا، اس بنا پر عہدِ جدید اور مسلمانانِ ہند کی نشاۃِ ثانیہ کی تاریخ میں یہ خطوط اور اُن کے ساتھ یہ حواشی تاریخی اور ادبی اعتبار سے بڑے اہم ہیں، تاریخی اس لئے کہ پرائیویٹ خطوط ایک طرف تو خود اپنے لکھنے والے کی اصل شخصیت کا آئینہ دار ہوتے ہیں جس میں چہرہ کے اچھے بُرے خدوخال جن سے شخصیت

کی ترکیب وتعمیر ہوتی ہے۔ وہ سب نظر آجاتے ہیں اور دوسری جانب بہت سے واقعات کا جو صحیح علم خطوط کے ذریعہ ہوتا ہے عام روایتی، کاغذی یا اخباری بیانات سے نہیں ہوسکتا اور ادبی اس لئے کہ ایک بڑا ادیب اور مصنف پرائیویٹ خطوط میں جو زبان استعمال کرتا ہے وہی دراصل اُس کے ادبی شعور اور ادبی مزاج وطبیعت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں آورد کے بجائے آمد، اور تکلف واہتمام کے بجائے بیساختگی اور برجستگی پائی جاتی ہے، ان خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب جتنے بڑے محقق اور مصنف تھے منتظم اور نگراں بھی اُسی درجہ کے تھے، معارف کے علمی معیار کو بلند کرنے، رفقائے دارالمصنفین کی تربیت کرنے اور دارالمصنفین کو ایک بلند پایہ ادارہ بنانے کے لئے انھوں نے کیا کیا اسکیمیں بتائیں اور اُن کو عمل میں لانے کے لئے کیسی جدوجہد کی، علماء اور فضلاء اور امرا اور رؤسا ان دونوں کا تعاون کس طرح حاصل کیا؟ علوم جدیدہ کی اُن کی نظر میں کتنی اہمیت تھی؟ اور کس طرح اُن پر ہر وقت کام کی ایک دُھن سوار رہتی تھی؟ ملکی اور بین الاقوامی سیاسیات پر اُن کی نظر کتنی گہری تھی؟ اس کا اندازہ اُن خطوط سے ہوتا ہے جو انھوں نے یورپ سے لکھے ہیں، دینی حمیت اور اخلاقی جسارت کا یہ عالم ہے کہ کلکتہ کے قیام کے زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی رندمشربی گوارا نہ کرسکے، اور اُن کو سخت محتسبانہ خطوط لکھے، مگر ساتھ ہی سید صاحب جمالیاتی ذوق سے محروم نہیں تھے، چنانچہ ان خطوط میں بعض فقرے اس کا ثبوت ہیں کہ سید صاحب دل کے صاف تھے، اُن کی دوستی اور دشمنی منافقت کے عیب سے پاک تھی، سید صاحب کو خود انگریزی نہ جاننے کا اتنا ہی افسوس ہے ص (۲۸۴) جتنا کہ (مسلمان ہوجانے کے بعد) مولانا دریابادی کی مولویانہ تنگ نظری سے ان کو شکوہ ہے ص (۲۸۶) شاردا ایکٹ جس کے ذریعہ کم سنی کی شادی کو قانوناً ممنوع اور قابلِ سزا قرار دیا گیا تھا اس کے خلاف مسلمانوں نے سخت احتجاج کیا اور مولانا محمد علی اور مولانا مفتی محمد کفایت اللہ وغیرہما سب نے ہی اس ایکٹ کو مداخلت فی الدین قرار دیا۔ لیکن سید صاحب ان حضرات سے متفق نہیں تھے، چنانچہ خط نمبر ۱۹۱ میں لکھتے ہیں :-

"نصوصِ شرعی کے اشارات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ نکاح بحالتِ بلوغ مستحسن ہے

اگر مسلمانوں کی حالت کا اقتضا ہو کہ عدم بلوغ کے غیر مستحسن نکاح سے لوگوں کو روکا جائے تو مسلمانوں کا امام ایسا کر سکتا ہے، مگر غیر مسلم حکومت میں ایسا نہیں ہو سکتا، بجز اس کے کہ مسلمان قضاۃ کا تقرر ہو اور وہ اسلامی مصالح کی بنا پر کوئی حکم دیں اور اُس پر کوئی تعزیر جاری کریں، مگر نکاح اور اُس کے لوازم ناجائز نہیں ہو سکتے"

سید صاحب کی یہ تحریر اس اعتبار سے بڑی اہم ہے کہ اس میں انھوں نے بعینہ وہی بات کہی ہے جو مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں پچھلے دنوں برہان میں لکھی گئی تھی، علاوہ ازیں باہمہ عالمانہ وقار و سنجیدگی سید صاحب ضلع جگت کے بادشاہ تھے اور فقرے چست کرنے میں اُنہیں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ یہاں تک کہ لوگوں کے نام بگاڑنا مثلاً عبدالحق کا عبدالباطل اور عبدالباری کو عباری لکھنا اُن کی شوخیٔ قلم کی ایک ادا تھی، اِس مجموعہ میں ایک خط مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی ہے جو انھوں نے سید صاحب کے خط کے جواب میں لکھا تھا۔ قطع نظر اس سے کہ مکتوباتِ سلیمانی میں ایک ایسے خط کو چھاپنے کی ضرورت ہی کیا تھی جس سے ایک مسلمان چہ جائیکہ عالمِ دین و ترجمانِ قرآن کی پردہ دری ہوتی ہے یہ خط اس اعتبار سے بڑے کام کی چیز ہے کہ اس سے مولانا آزاد کی شخصیت کے ایک اہم پہلو پر روشنی پڑتی ہے اور وہ یہ ہے کہ پبلک لائف میں اُن کی خودداری کا رشتہ خودسری اور بالا پنداری سے جا ملا تھا، کسی کو نظر میں لاتے تھے اور نہ کسی کو اپنے درجہ اور مرتبہ کا سمجھتے تھے لیکن اس کے باوجود دین کے معاملہ میں اس قدر منکسر النفس اور متواضع تھے کہ سید صاحب نے مولانا کے تنخواہ یاب ماتحت ہونے کے باوجود اُنہیں ایک خط میں سرزنش کی تو مولانا نے بے چون وچرا اپنی معصیت کا اقرار غایت ندامت و شرمساری کے ساتھ کر لیا اور آئندہ اُس سے مجتنب رہنے کا عہد و پیمان کیا، اسی طرح کا ایک اور واقعہ تبصرہ نگار کو ذاتی طور پر معلوم ہے، مولانا کی وفات سے تین چار برس پہلے کی بات ہے، دلی کے ایک نوجوان قاری صاحب کسی تقریب سے مولانا کی کوٹھی پر پہونچ گئے اور وہاں موقع پاکر دعوت و تبلیغ کا فرض انھوں نے اس طرح ادا کیا کہ مولانا سے کہا "حضرت! کیا آپ وزیرِ تعلیم ہو کر اس بات کو بالکل بھول گئے کہ آپ ایک عالمِ دین اور ترجمانِ قرآن بھی ہیں، نئی دلی کی جامع مسجد آپ کے دفتر کے

سامنے ہے مگر اس کے باوجود آپ جمعہ کی نماز کے لئے وہاں نہیں آتے" خود قاری صاحب کا بیان ہے کہ مولانا یہ سنتے ہی آب دیدہ ہو گئے اور بجائے معذرت کرنے کے اپنی کوتاہی کا اقرار کیا اور قاری صاحب سے درخواست کی کہ وہ اُن کے پاس وقتاً فوقتاً آتے رہیں۔ عمر خیام کے بقول :-

"وآنکس کہ گناہ نکرد چون زیست بگو! گناہ کس سے نہیں ہوتا اور کوتاہی و کمزوری کس میں نہیں پائی جاتی، لیکن اوّل تو گناہ گناہ میں فرق ہوتا ہے، ایک شخص شراب پیتا ہے مگر چوری اور زنا نہیں کرتا اور دوسرا شراب نہیں پیتا مگر سرقہ اور زنا کا مرتکب ہوتا ہے، ظاہر ہے گنہگار دونوں ہیں لیکن ایک کا گناہ ایسا ہے جو شرافتِ نفس کے ساتھ (جو بہت سی خوبیوں کا سرچشمہ ہے) جمع ہو سکتا ہے اور دوسرے کا گناہ اُس کے دناءتِ نفس اور کمینہ پن کی دلیل ہے اور پھر ایک انسان کے کیرکٹر کی خوبی اور اُسکے جوہرِ شرافت و انسانیت کا اصل اندازہ اس چیز سے ہوتا ہے کہ خود اس کا اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کے متعلق ردِ عمل کیا ہے؟ اگر وہ ان پر نادم اور محجوب ہے اور اُس کا ذکر سنتے ہی اس کی پیشانی پر عرقِ انفعال کے قطرے نمودار ہو گئے ہیں تو یقیناً وہ بڑا قابلِ قدر اور لائقِ مدح و تحسین انسان ہے، ہم جانتے ہیں کہ وہ لوگ جنھیں مولانا آزاد کے ساتھ خدا واسطے کا بیر ہے وہ اس خط کو اپنی کامجوئی کے لئے استعمال کریں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے نزدیک یہ خط مولانا کی عظمت میں اضافہ ہی کرتا ہے نہ کہ کوئی کمی!

معشوق من آنست کہ نزدِ تو زشت ست

اور یوں بھی اس خط میں نئی بات ہے کونسی؟ وہی اعتراف و اقرار جو مولانا نے اپنی کتاب تذکرہ اور غبارِ خاطر میں تشبیہ اور استعارہ کی زبان میں کیا تھا، یہاں بلا ایہام و توریہ کر لیا ہے، تاریخ نہ کسی پر رحم کھاتی اور نہ کسی کی عظمت و شہرت کی رعایت کرتی ہے اس بنا پر ان خطوط سے اگر تصویر کا کوئی دوسرا رُخ بھی نظر آتا تو ان خطوط کی تاریخی اہمیت پھر بھی اپنی جگہ قائم رہتی مگر یہاں تو صورتِ حال یہ ہے کہ سید صاحب اور مولانا ابوالکلام آزاد دونوں میں کچھ کمزوریاں ضرور نظر آتی ہیں لیکن ایک انسان کی صحیح قدر و قیمت کا تعین اُسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ اُس کی خوبیوں اور کمالات کے ساتھ اُس کی کمزوریاں اُن کے متعلق خود اُس کا ردِ عمل، اور پھر عمر میں ترقی اور اضافہ کے ساتھ اُن کمزوریوں کی اصلاح اور اُن کو رفع کرنے کی کوشش، ان سب کو بیک وقت سامنے رکھ کر غور کیا جائے، اس حیثیت سے

مکاتیبِ سلیمانی کے آئینہ میں سید صاحب اور مولانا آزاد کی شخصیتوں کے جو نقوش اُبھرتے ہیں اُن میں بڑی عظمت و بزرگی، بلندیٔ کردار اور رفعتِ اخلاقی ہے نہ کہ خدانخواستہ کوئی ایسی پستی جو ان دونوں میں سے کسی ایک کے دامانِ فضائل پر بدنما داغ کہلا سکے، البتہ مولوی مسعود علی صاحب کے معاملہ سے متعلق جو خطوط ہیں اُن میں سے خط نمبر ۲۱۱ میں سید صاحب مکتوب الیہ کو صاف لفظوں میں لکھتے ہیں "مہربانی فرما کر اس خط کو چاک کر دیجیگا" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کو اس بات کا احساس تھا کہ اس معاملہ کی تشہیر صرف سید صاحب اور مولوی مسعود علی صاحب کی نہیں بلکہ دارالمصنفین کی بدنامی و رسوائی کا باعث ہوگی، اس بنا پر ہونا یہی چاہئے تھا کہ مکتوب نگار کی خواہش کے احترام میں یہ اور اس جیسے دوسرے خطوط کو چاک کر دیا جاتا اور اگر چاک نہ ہو سکے تھے تو ان کی اشاعت نہ ہوتی، ان سب نزاکتوں اور پیچیدگیوں کا احساس فاضل جامع کو پورے طور پر ہے چنانچہ شروع میں جو مقدمہ ان کے قلم سے ہے اس میں انھوں نے ان سب کے درمیان عملی تطبیق و توفیق کی شکل پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن چونکہ تاریخ اور عقیدت و ارادت کے تعلقات کے درمیان تطبیق کی کوئی شکل بھی ایسی نہیں ہو سکتی جو سب کے لئے قابلِ قبول ہو اس لئے مقدمہ میں جو کوشش کی گئی ہے اسے کامیاب نہیں کہا جا سکتا،

سید صاحب نے ایک خط میں اسد ملتانی صاحب مرحوم کا ایک خط بھی نقل کیا ہے اس خط کے بعض فقرے اس لائق ہیں کہ آج بھی مسلمانوں کو انہیں پڑھنا اور اُن سے سبق لینا چاہیئے، مرحوم لکھتے ہیں :-

"سکھوں کی صوفیانہ جماعت میں اسلامی عنصر بہت زیادہ تھا اور ممکن تھا کہ ایک عرصہ کے بعد یہ جماعت اسلام میں جذب ہو جائے مگر فرخ سیر وغیرہ کے سیاسی مقابلے نے اس جماعت کو ایک دشمنِ اسلام جنگجو قوم بنا دیا، اسی طرح آریہ سماج کی تحریک فی الحقیقت ہندوؤں کو اسلام سے زیادہ قریب لانیوالی تھی چنانچہ اس کی ابتدائی نشو و نما بھی مسلمانوں کی سرپرستی میں ہوئی، اگر اس کی طرف زیادہ توجہ نہ کی جاتی تو یہ فرقہ یا تو ہندوؤں کی اکثر سماجوں کی طرح گوشۂ گمنامی میں ہوتا یا شاید اسلام میں مل جاتا مگر افسوس ..... مولوی ثناء اللہ کے علمی جہاد نے اس فرقہ کو نہ صرف اہم بلکہ اسلام کا سخت دشمن بنا دیا" (ص ۲۷۱) بہرحال یہ مجموعہ تاریخی اور ادبی اعتبار سے ایک خاصہ کی چیز ہے، آئندہ لوگ اس کو بطور حوالہ استعمال کریں گے۔